جدید اردو غزل کے عناصر اربعہ کا فلسفہ اخلاق

زرتاشیہ صغیر
طارق محمود ہاشمی

ABSTRACT:

Ghazal is a cultural genre of Persian and Urdu poetry. During british colonial period in sub-continent ghazal poets was not appreciated by contemporary criticism but poets much struggled for its thematic and stylistic development. It is notable that ethics and social moral values are dominating theme in their poetry because of their affiliation with mysticism. These poets urged on the spiritual values educated by religion and were established in eastern society.

Keywords:

اردو غزل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس صنفِ شعر نے مختلف النوع الزامات کا سامنا تو کیا لیکن اس کے یہاں تہذیبی عناصر کا تاریخی اور معاشرتی اقدار کا معروضی جائزہ کم ہی لیا گیا۔ جہاں اُردو غزل پر یہ الزام لگا کہ یہ محض حسن و عشق کے موضوعات کو ہی سمو سکتی ہے۔ وہاں حسن و عشق کو جن علامات کے طور پر برتا گیا ہے اس سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ اردو غزل اپنی تہذیب کی نمائندہ اور اخلاقی اقدار کی ہمیشہ سے علم بردار رہی ہے۔ زمانے کے بدلتے رویے اور زندگی کے سنگین مسائل لطیف پیرائے میں بیان کر دیے گئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں تک پھیلا ہوا دور جو اُردو غزل کا عبوری دور ہے اس میں شاعری کو نئی نزاکتوں، زبان اسلوب کی بھرپور توانائیوں اور بلاغتوں سے مالامال کیا۔ غزل کا عبوری دور قدیم و جدید روایات کا امتزاج ہے۔ جہاں اُردو غزل کے روایتی مضامین کو اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت

سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جدت پیدا کی گئی۔ زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی داغ بیل بھی ڈالی گئی۔ حیات و کائنات کے اسرار و رموز سے آگہی کا شعور، قومی و ملی اقدار کا احیاء، رواداری و انسان دوستی اور ارتقا جیسی اقدار عبوری دور کے نظام اخلاق کا حصہ بنیں۔ داغ اور امیر کے بعد اردو غزل ایک نئے دور میں داخل ہوئی جہاں اُسے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ جگر، حسرت، فانی اور اصغر جیسے عظیم شعراء ایک نئے تخلیقی امکان کے ساتھ سامنے آئے۔

حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں صنفِ غزل کو اعتراض کا نشانہ بنایا اور نظم کو اظہار کے لیے بہتر ذریعہ قرار دیا ہے۔ وقت اور حالات کے پیشِ نظر غزل کی بہ نسبت نظم اصلاحی مضامین کے لیے موزوں صنفِ سخن تھی لہٰذا حالی نے نظم کو غزل پر ترجیح دی۔ مسلمانوں کی زبوں حالی اور قوم کو اُن کی عظمتِ رفتہ کی یاد دہانی اور اصلاح کے لیے نظم ہی موزوں صنفِ سخن تھی۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ غزل کا ادبی مقام و مرتبہ کم ہے کیونکہ حالی کے نزدیک غزل محض حسن و عشق سے تعلق رکھتی ہے حالانکہ غزل انقلاب زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ رہی ہے۔ کسی بھی دور کی غزل اُٹھا کر دیکھ لیں اُس دور کی مخصوص فضا، شاعرانہ مزاج اور تہذیب اور معاشرت کا عکس نظر آئے گا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے موضوعات بھی ملیں گے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی شعرا کے یہاں بھی اُس زمانے کا مخصوص مزاج اور فضا نظر آتی ہے اور بدلتے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر حقائق اور اہم مسائل زندگی کو زیرِ بحث لانے کا رجحان بھی شروع ہوا۔ یوسف حسین خان اردو غزل میں صنفِ غزل کے ارتقاء پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ ذہنی زندگی سے لاتعلق نہ ہو جائے۔ غزل کا آرٹ بھی سکوتی آرٹ نہیں کہ جہاں تھا وہیں رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں رچا ہوا ہے۔ اسی واسطے اس کی معنی آفرینیوں کی کوئی حد نہیں۔"[۱۵]

غزل کے عبوری دور میں اس صنف نے اپنے اندر زندگی کی حرکت اور نمو کو تصورِ اخلاق سے کس طرح ہم آہنگ کیا اس کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

حسرت موہانی اردو غزل کے عبوری دور کے اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے نہایت بے باکی سے زندگی کے مشاہدات و تجربات کو شعری سانچوں میں ڈھال دیا۔ اخلاقی اقدار کے حوالے سے حسرت کا کافی کلام ہے۔ حسرت کی شخصیت پر چونکہ تقویٰ اور پاکبازی غالب رہی جو کہ مذہبی روایات و اقدار کا اثر تھا۔ اُن کے شعروں میں بھی وہی

رنگ جھلکتا ہے۔ حسرت نظریۂ توحید اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو ہی ہر کامیابی و کامرانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہی عشق ذرے کو آفتاب اور قطرے کو دریا بنا دیتا ہے۔ بقول حسرت:

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا[۲]

دُنیا کی بے ثباتی اور عارضی زندگی کو بھی حسرت نے موضوع بنایا ہے۔ اُن کے نزدیک دنیا کی آسائشیں کتنی بھی ہوں بادشاہ کو بھی اُسی طرح قبر میں جانا ہے جیسے کہ ایک غریب مزدور کو جانا ہے۔

حسرت کے کلام میں قناعت، صبر، مستقل مزاجی، بلند حوصلگی، عرفان و آگہی اور ایثار قربانی جیسی اخلاقی اقدار پائی جاتی ہیں۔ حسرت قناعت کو بہت بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ جو مال و دولت رکھنے والوں سے مرعوب نہیں ہونے دیتی۔ بقول حسرت:

قناعت کی بدولت غایت بے احتیاجی نے
فقیری میں بھی ہم کو بے نیاز اہلِ زر رکھا[۳]

حسرت کے نزدیک عشقِ حقیقی میں ہی انسانیت کی عافیت ہے کیونکہ اسی میں فنا ہو کر ہمیشہ رہنے والی آسائشیں انسان کا مقدر بن جاتی ہیں۔

عشق میں محبوب کی رضا پہ راضی ہو جانا ہی عشق کی اصل ہے۔ مگر حسرت اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان ہونے کے ناطے بہت سے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں اور راضی بالرضا کا مرحلہ دشوار ہوتا ہے اور نہایت بے باکانہ انداز میں اپنی اسی خامی کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

سخت ہے عشق میں مقام رضا
ہم سے بھی طے یہ مرحلہ نہ ہوا[۴]

حسرت نے بھی دیگر شعراء کی طرح معاشرتی رویوں کو تنقید کا نشانہ نایا ہے۔ ظاہر اور باطن میں تضاد اور ریاکاری جیسے رزائل اختلاف جو کہ معاشرتی بگاڑ کا بھی باعث بن جاتے ہیں۔ حسرت کے نزدیک عبادت جو محض ثواب حاصل کرنے کے لیے کی جائے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اصل عبادت تو وہ ہے کہ جو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ اُردو غزل میں زاہد اور شیخ جیسے کرداروں پر ہمیشہ منافقت اور ریاکاری کے باعث

طنز کیا گیا ہے۔ حسرت نے بھی اُردو غزل کی اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے شیخ و زاہد کے رویوں کی یوں تصویر کشی کی ہے:

ہر گھڑی شیخ کو ہے فکرِ ثواب
یہ بھی اک طرح کا عذاب ہوا[۵]

ایک اور جگہ اسی موضوع پر یوں بات کرتے ہیں:

نورِ عرفان کی عبث ہے دلِ زاہد میں تلاش
اور وہاں خاک نہیں خواہش جنت کے سوا[۶]

حسرت اپنے کلام میں بلند ہمتی اور حوصلگی کا درس دیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اُن کے خیال میں بلند حوصلہ ہو تو مایوسیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اپنے فن و ہنر کے بل بوتے پر اپنے لیے آسایشیں اور سہولتیں حاصل کی جائیں۔ اقبال کی طرح حسرت کے بھی کلام کا کافی حصہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ہے۔ حسرتِ تحریک پاکستان کے سرگرم رکن تھے اور اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
خدمتِ اہل جور رکھ کر نہ قبول زنہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر[۷]

حسرت تحریک آزادی کے سرگرم رکن بھی تھے اور اپنی شاعری سے مسلمانوں میں جذبۂ حریت پیدا کیا اور اُن کے نزدیک انگریزوں کا مسلمانوں پر ظلم و ستم مسلمان قوم کی بیداری کا سبب ہے۔ بظاہر یہ مسلمانوں کے لیے بہت برا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ خیر ہے کیوں کہ یہ مسلمان کی بیداری کا سبب ہے۔

جورِ یورپ ہے بنا بیداریٔ اسلام کی
خیر ہے دراصل یہ باآنکہ شکلِ شر میں ہے[۸]
طلب جاہ کہاں تک حسرت
چھوڑ اس خام خیال کی حرص[۹]

اپنے معاشرے کی بدلتی اقدار پر افسوس کرتے ہوئے حسرت کہتے ہیں کہ یہاں دولت ہی سب کچھ ہے اور صاحبِ علم و عمل کی قدر ختم ہو گئی ہے جو کہ جہالت کی نشانی ہے۔ بقول حسرت:

حسرت یہ دورِ جہل ہے، دولت کو ہے فروغ
اب ہم سے قدر دانی علم و عمل گئی[۱۰]

غزل کے عبوری دور میں حسرت موہانی نے معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو نہایت عمدگی سے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ اردو غزل کی قدیم روایت کو بھی قائم رکھا ہے اور جدید انداز بھی اپنایا ہے جو انھیں اُردو غزل کا منفرد شاعر بناتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

"مولانا حسرت نے حسن و عشق کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اخلاقی مسائل کو بھی اپنی شاعری میں کھینچ لانے کی کوشش کی ہے۔"[۱۱]

حسرت کے کلام کو پڑھ کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اخلاقی موضوعات کو نہایت کامیابی سے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ اور ان کے تغزل کی شگفتگی اور رعنائی بھی برقرار رہی ہے۔

اردو غزل کے عبوری دور کے ایک اور اہم شاعر فانی بدایونی جن کے کلام کا بیش تر حصہ سوز و یاس پر مشتمل ہے مگر آپ کے یہاں اخلاقی اقدار و روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ فانی کے یہاں عزتِ نفس، خودداری، بلند حوصلگی، تسلیم و رضا، اُمید اور انسانی عظمت جیسی اقدار پائی جاتی ہیں۔

فانی کے نزدیک انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں سب سے افضل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا شاہ کار انسان ہے جو اپنے اندر بدرجہ اتم صفات رکھتا ہے اور اعلیٰ اقدار و صفات کا حامل ہو جائے تو "خلیفہ فی الارض" ہو جاتا ہے:

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز[۱۲]

جہاں تخلیقِ انسان کو راز کہہ کر فانی نے شعر میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ وہاں خیر و شر کے امتیاز قائم کرنے کے فلسفے کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا ہے اور خیر و شر دونوں میں فرق کرنا بھی سکھایا ہے۔ اس لیے وہ اپنے افعال و اعمال میں اختیار رکھتا ہے۔ مگر کچھ چیزیں تقدیر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن میں انسان کا اختیار نہیں ہوتا لیکن اچھے اعمال اور خیر یا بھلائی کی طرف رجوع کرنا بہت حد تک انسان کے اختیار میں ہے۔ فانی نے اپنی غزل میں خیر و شر اور جبر و قدر کے مسائل کو ایک عالمِ اسلام کی طرح واشگاف کیا ہے۔ اس حوالے سے مغنی تبسم اپنی کتاب فانی بدایونی میں رقم طراز ہیں:

''فانی نے حیات و کائنات کی متصوفانہ تعبیروں کو جوں کا توں قبول نہیں کیا۔ اُنھوں نے وجدان کو یہاں بھی اپنا رہنما بنایا اور طلب و جستجو کی راہ میں تخیل اور جذبات کی مشعل روشن رکھی۔ لیکن اس راستے پر چلتے ہوئے فانی مذہب کے بنیادی عقاید سے کسی صورت منحرف ہونا نہیں چاہتے تھے۔''[۱۳]

اسی جبر و قدر کے معاملے میں فانی یوں بیان کرتے ہیں:

فانی ترا عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں[۱۴]

فانی کے یہاں جذبۂ عشق قدر کے طور پر موجود ہے اور زندگی کے اسرار و رموز کی آگہی کے لیے اُن کا نکتہ نظر موضوعی اور داخلی ہے۔ اس لیے کائنات کے پوشیدہ رموز کو سمجھنے کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں:

ہاں یہاں کوئی شے نہیں باطل
عشق ہے راز، عقل پردہ راز[۱۵]

فانی کے کلام میں بلند حوصلگی اور خودداری جیسی اخلاقی اقدار پائی جاتی ہیں۔ اُن کا اسی موضوع پر شعر ذیل میں دیا گیا ہے:

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں[۱۶]

فانی دنیا کی بے ثباتی کو بھی موضوع سخن بناتے ہیں اور زندگی کو جس کی بے اعتباری ایک حقیقت ہے۔ فانی اس کو نہ حل ہونے والا معمہ قرار دیتے ہیں اور موت کو زندگی کا ہوش کہتے ہیں۔ فانی کے نزدیک موت کے بعد ہی انسان پر سارے راز افشا ہو جاتے ہیں اور وہ حقیقی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

فانی اس جہانِ ناپید میں اچھے تعلقات استوار کرنے کے حامی ہیں۔ اُن کی نظر میں اس دنیا میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسروں کے ساتھ نرمی اور شفقت سے رہا جائے۔ بالکل اس نسیم سحر کی طرح جو باغ میں غنچوں پر پڑتی ہے اور اُن پر خوش گوار اثر چھوڑتی ہے:

گھڑیاں اپنی عمر کی ہم نے غنچوں میں چل پھر کے گزاریں
آئے تھے فانی باغ جہاں میں گویا مثلِ نسیم سحر ہم[۱۷]

فانی کے یہاں موت کا تصور دوسرے شعراء سے کافی مختلف ہے اُن کے نزدیک انسان کی مشکلات اور دکھ درد موت کی آغوش میں جا کر ہی ختم ہو سکتے ہیں۔ وہ انسان کے اُس داخلی رویے کی عکاسی کرتے ہیں جب خارج کی ہنگامہ پروریوں سے گھبرا کر وہ گوشہ عافیت میں پناہ تلاش کرتا ہے اور موت ہی وہ ذریعہ ہے جس کے بعد انسان کی حقیقی منزل اُسے حاصل ہوتی ہے۔

سکونِ قلب میسر ہے موت ہی میں سہی
غرض کہ خاتمہ رنج و اضطراب ہوا[۱۸]

اسی حوالے سے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

"فانی کے ہاں موت ایک انفرادی رد عمل اور سارے غموں کا وجدانی حل ہے۔ یہ ایک شاعرانہ اظہار ہے۔ اس حقیقت کا کہ بسا اوقات زمانے کی تیز رفتاری فرد کی شخصیت اور اس کے پورے نظام احساس کو اس حد تک گھائل کر دیتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہی اندر خود کو آزاد کرنے کے وسائل تلاش کرتا ہے۔ موت کا یہ روپ ایک فرد کے Passive احتجاج اور خود کو سب سے الگ دیکھنے کے غرور کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ جو ہماری شاعری میں فانی کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا۔"[۱۹]

فانی کی شاعری کا بنیادی موضوع غم ہے مگر یہ غم اُن کو زندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ فانی نے موت اور غم کے موضوع کو جس طرح برتا ہے وہ یاسیت اور قنوطیت کا تاثر لیتے ہوئے نہیں ہے بلکہ انھوں نے موت جیسی تلخ حقیقت کو قابل قبول بنانے کی سعی کی ہے جو اُن کے کلام میں بے خودی جیسی قدر کو سامنے لاتی ہے جہاں فنا کے فلسفے کا ادراک ہو جاتا ہے۔

ٹوٹا طلسم ہستی فانی کے راز کا
احسان مند ہوں الم جاں گداز کا[۲۰]

فانی عبوری دور کے بلند مرتبہ شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو سوقیت اور ابتذال سے پاک کر کے مہذب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ فانی نے زبان و بیان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ درد مند لہجے میں مصائب و آلام اور تصورِ موت کی جس طرح تصویر کشی کی ہے۔ اس میں زندگی گزارنے کا حوصلہ اور موت جیسی اٹل اور تلخ حقیقت کو گوارا بنا دیا ہے۔ فانی کے اخلاقی تصورات غمِ حیات کے مقابل حوصلہ مندی، قلبی سکون اور ہستی ناپیدار پر مشتمل ہیں۔ جو اُن کے تصوفانہ نظریات کے آئینہ دار ہیں۔

اصغر گونڈوی کی غزل میں فلسفہ حیات، فلسفہ عمل اور حرکت، فقر واستغنا اور عظمت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ اصغر کی غزل جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ اصغر کی غزل غالب اور اقبال کی فکر اور درد کے تصوف کا حسین امتزاج ہے۔ ڈاکٹر ہارون قادر اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"اقبال کی طرح اصغر گونڈوی کے فلسفہ حیات میں بھی جہد وکشاکش، عمل پیہم، سخت کوشش،، لذت جوش طلب، شوریدگی شوق اور سوز و تلاطم زندگی کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں۔"[٢١]

اصغر کے نزدیک زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے اور اس میں مسلسل جستجو اور طلب کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اصغر کے یہاں زندگی حرکت کا دوسرا نام ہے۔ جمود اور سکون موت ہے۔ ان تصورات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے، جو ہے اضطراب میں[٢٢]

جستجو ہے زندگی ، ذوق طلب ہے زندگی
زندگی کا راز لیکن دوری منزل میں ہے[٢٣]

عمل پیہم کے فلسفے پر زور دیتے ہوئے اصغر کہتے ہیں کہ اس فنا ہو جانے والی دنیا میں جہاں ہر چیز ناپائیدا رہے، آرام وسکون کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ سختیاں جھیل کر ہی انسان اپنا جہان خود پیدا کر سکتا ہے:

اِس جہانِ غیر میں آرام کیا، راحت کہاں
لطف ہے جب اپنی دنیا آپ پیدا کیجیے[٢٤]

اصغر کے یہاں عشق حقیقی قدر کے طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ہی جلوے کائنات میں نظر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سوا کسی بھی چیز کی ہستی وبستی محض دھوکا ہے۔

اصغر کے نزدیک عشق وہ جذبہ ہے جو انسان کو عقل سے آگے لے جاتا ہے۔ عقل محدود اور متناہی سلسلوں سے عبارت ہے جب کہ عشق لامحدود اور لامتناہی سلسلوں سے انسان کو جوڑ کر اُسے فطرت کی اُن گہرائیوں سے آشنا کرتی ہے جو عقل سے ماوراء ہوتی ہیں۔ اصغر اپنے اس تصور کو یوں بیان کرتے ہیں:

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں بیاباں ہے[٢٥]

اصغر کے کلام میں انسان کی عظمت محبوب موضوع کے طور پر ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک انسان اپنے عمل صالح اور کردار کی مضبوطی سے خدا کا مظہر بن جائے نہ کہ اپنے مدعا بیان کرتے پھرے۔

اصغر کی غزل میں اخلاقی اقدار بلند تر سطحوں پر برتی گئی ہیں۔ وہ غزل کو محض حسن و عشق کی قلبی وارداتوں کے محدود معانی کی بجائے اخلاقی موضوعات سے وسعت عطا کرتے ہیں اور حسن کو وسیع تر معنوں میں اختیار کرنے کو اہم جانتے ہوئے اصغر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"شاعری کا عام موضوع حسن ہے۔ اربابِ فقر و تصوف کے نزدیک اس کا مفہوم نہایت وسیع ہے جس میں مجاز و حقیقت، اخلاقی اور مادی حسن کی تمام ادائیں داخل ہیں۔"[۲۶]

اصغر کے یہاں بھی اقبال کی طرح مردِ کامل کا تصور اہم اخلاقی قدر کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس موضوع کو اپنے ایک شعر میں یوں بیاں کرتے ہیں:

توڑ کر دستِ طلب محو رضا ہو جائے
سر سے پا تک ہمہ تن آپ دعا ہو جائے[۲۷]

انسان کی عظمت کے بے حد معترف ہونے کے باعث اصغر مختلف انداز سے اپنے کلام میں اسے بیان کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک کائنات کا اہم ترین کردار انسان ہے۔ وہ انسان جو کبھی ارتقائی منزل طے کر تا ستاروں اور چاند کی تسخیر کرتا ہے اور کبھی زمین کی گہرائیوں سے پوشیدہ خزانے دریافت کرتا ہے۔

اصغر نے عملِ پیہم پر اپنے کلام میں جگہ جگہ زور دیا ہے اور اسی کو کامیابی و کامرانی کی وجہ بتایا ہے۔ اُن کے نزدیک اپنے عمل سے انسان وہ بلندی حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے رب کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اپنے رب کی رضا میں راضی ہو کر اُس کا ولی بن جاتا ہے۔ کیوں کہ اس مادہ پرست دنیا میں کوئی انسان دوسرے کا دکھ یا درد نہیں سمجھ سکتا۔ مگر اپنے عمل اور کردار کی بلندی سے رب کی ہمنوائی ضرور ہو جاتی ہے۔ اصغر اسی موضوع کو یوں بیان کرتے ہیں:

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا[۲۸]

اصغر کے نزدیک بزمِ شہود یا عالمِ موجودات کو ترک کرنا درست نہیں وہ اس عالم موجودات کی بے ثباتی سے اگر بخوبی واقف ہے تو وہ اس بزم شہود میں ہر دم سرگرمِ عمل رہنے کے بھی حامی ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ محض دھوکا ہے۔ اُن کے نزدیک ایسا رہنا عرفان اور آگہی سے بہتر ہے۔ اپنے اس تصور کو یوں بیان کرتے ہیں:

مقام جبل کو پایا نہ علم و عرفان نے
میں بے خبر ہوں بہ اندازہ قریب شہود[۲۹]

اصغر اپنی معاشرتی اخلاقی اقدار کی پامالی سے نالاں نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہندوستانی معاشرہ شائستگی اور اخلاقیات فراموش کر چکا ہے۔

اخلاقی اقدار کے زوال پر تاسف کا جو اظہار اصغر کے کلام میں ملتا ہے۔ اُس کے متعلق ڈاکٹر سعد اللہ یوں رقم طراز ہیں:

"یہ دور جو انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے شروع ہو کر بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ہندی، اسلامی، اخلاقی اور تہذیبی و معاشرتی قدروں کے احیاء کا اگر نہیں تو اپنے تحت الشعور سے الشعور کی سطح پر انھیں ابھار لانے کا ضرور ہے۔ یہ انھیں ابھارنا بھی چاہتا ہے اور اُن کے زوال کا شاکی بھی ہے۔"[۳۰]

اصغر کی غزلوں میں عشقِ الٰہی، قربانی، صبر و توکل، عجز و انکساری، جہد مسلسل، خودداری اور تشکر جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار پائی جاتی ہے۔ جو نہ صرف فرد کی فلاح کے لیے ضروری ہیں بلکہ ایک صحت مند اور مفید معاشرے کی تشکیل میں بھی سود مند ثابت ہوتی ہیں اور اصغر کے یہی افکار انھیں بیسویں صدی کا منفرد شاعر بناتے ہیں۔

عبوری دور کے اہم غزل گو شاعر جگر کے یہاں حسن و جمال محض محبوب کے خدوخال تک محدود نہیں بلکہ اخلاقی قدر کے طور پر نظر آتا ہے۔ جہاں تصور جمال ذات سے ہوتا ہوا اجتماعیت تک جا پہنچا ہے اور زندگی کا ہر حسن و عمل جمال ہو جاتا ہے۔ جگر نے اپنے بیان کی تازہ کاری سے اپنی غزل کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ جس میں مسلسل ارتقاء ہے:

"میری شاعری غزل تک محدود ہے۔۔۔ مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے، تضاد نہیں۔۔۔ جس طرح میری زندگی تازہ بہ تازہ نو بہ نو انقلابات و تغیرات کے ماتحت تبدیل ہوتی گئی۔ بعینہ اسی طرح رنگِ کلام بھی تبدیل ہوتا گیا۔"[۳۱]

جگر نے اپنی غزل کے بارے میں کہا کہ اُن کی زندگی اور غزل میں کوئی تضاد نہیں جو کچھ محسوس کیا وہی بیان کر دیا۔ یہی بیان کی صداقت انھیں اردو غزل کا اہم شاعر بناتی ہے۔ جگر کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ شراب و رندی کے شاعر ہیں۔ مگر اُن کا کلام دیکھا جائے تو جس بھرپور انداز میں الٰہیات کے موضوعات پر غزلیں کہی ہیں۔ تو یہ

سراسر زیادتی ہو گی کہ ایسے شاعر کو شراب و شاہد کے حوالے سے جانا جائے۔ جگر نے اخلاقی اقدار کے حوالے سے اشعار کہے ہیں۔ جگر کے یہاں واحدانیتِ باری تعالیٰ ایک اہم قدر کے طور پر موجود ہے۔ جگر نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کے متعلق شعر کہے ہیں:

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے یکتا نظر آیا[۳۲]

جگر کے ہاں بے خودی کا تصور ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک جب انسان دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو وہ معرفتِ الٰہی سے سرفراز ہو جاتا ہے۔ اسی خیال کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کرتے ہیں:

وارفتگیٔ شوق کا اللہ رے کمال
جو بے خبر ہوا وہ بڑا باخبر ہوا[۳۳]

اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب انسان عشق کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں فنا ہو کر اس کی اپنی پہچان نہیں رہتی بلکہ عشق کا حصول ہی اس کا مقصد ہو جاتا ہے۔

فنائے عشق کیا ہے، کارواں در کارواں ہونا
یہاں تک منتشر ہونا کہ بے نام و نشاں ہونا[۳۴]

جگر کے یہاں عرفانِ ذات ایک قدر کے طور پر نظر آتا ہے۔ اپنی ذات کی پہچان کی بدولت ہی انسان اپنی زندگی کے مقصد اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

یہی ہے سب سے بڑھ کر محرمِ اسرار ہو جانا
میسر ہو اگر اپنا یہاں دیدار ہو جانا[۳۵]

جگر افراد کی باطنی قوتوں سے بخوبی واقف ہیں کہ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تو بشریت کی معراج اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس کائنات کا محور و مرکز جو خدائے بزرگ و برتر کا نمائندہ اور خلیفہ ہے۔ حق کے راستے پر تو اُس سے بڑھ کر اس کائنات میں کوئی شے نہیں ہے۔ مگر تاسف کا اظہار جگر کے ہاں ملتا ہے کہ ایسے انسان اب اس دور میں ملتے ہی نہیں ہیں:

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر
انساں ہی ایک چیز ہے انسان مگر کہاں[۳۶]

ہر طرح کے معاشرتی رویے کو جگر نے اپنے کلام میں موضوع بنایا ہے کہ انسان دوسرے انسان سے بہت دور ہو گیا۔ حقوق العباد کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ جگر کے دور میں مغرب کی پیروی کرنے والوں نے جہاں غزل کے خلاف آواز اٹھائی اور نظم کے فروغ کی تائید کی وہاں مادیت پرستی کو فروغ حاصل ہوا۔ جو کہ مغربی اقدار کی پیروی کا نتیجہ تھا۔ جگر اسی مادیت پرستی کے خلاف اور انسان دوستی کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آدمی کو آدمی سے بعد، وہ بھی کس قدر
زندگی کو زندگی کا رازداں سمجھا تھا میں[۳۷]

ایک اور جگہ موضوع پر یوں خیال بیان کرتے ہیں:

کیا قیامت ہے کہ اس دور ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں[۳۸]

جگر کا دور ایسا دور تھا جس میں برصغیر پر برطانوی حکومت کا راج تھا۔ مسلمانوں کا استحصال ہر طرح سے کیا جا رہا تھا۔ انسانیت کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں تو ایسے میں جگر جیسا انسان، دوست اور ملنسار شخص کیسے متاثر نہ ہوتا اور شاعر فطرتاً اپنے کلام میں انسانیت، عظمت انسانی عرفانِ ذات اور کرداری و اخلاقی تعمیر کے موضوعات سے کیسے گریز کر سکتا ہے اور ایسے مشکل حالات میں بھی بلند اور عالی حوصلہ ہی رہتے ہیں۔ بربادیوں کو عرفان کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بربادیوں نے لوٹ کے سامانِ آرزو
ناکامیوں کو حاصلِ عرفاں بنا دیا[۳۹]

جگر نے اخلاقی قدروں پر کمال اسلوب میں شعر کہے ہیں اور یہ انداز بہت سادہ مگر دل میں اُتر جانے والا ہے۔ نظمِ جدید کا بیسویں صدی میں جو طوفان اُٹھا وہ غزل کو ختم ہی کر دیتا مگر جگر نے اپنے منفرد اسلوب اور موضوعات سے غزل کی صنف کو زندہ رکھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:

"جگر صاحب اپنی غزل سرائی سے مذاق جمہوری تسکین کا سامان فراہم نہ کرنے دیتے تو بہت ممکن تھا کہ غزل کا چراغ اسی کی زد میں آجاتا اور خواص پسند غزل خطرے میں پڑ جاتی۔ اس لیے جگر کی شعر گوئی و شعر خوانی کی اہمیت سے انکار کرنا تاریخی غلطی ہو گی۔ اُردو غزل کو مقبول، خاص و عام بنانے، اس کی صالح روایات کو محفوظ رکھنے، غزل کے

مخالفین سے غزل کی اہمیت منوانے اور اس کو نیا رنگ روپ عطا کرنے اور اسے توانائی و تازگی بخشنے میں جگر کا بڑا حصہ ہے۔"[۴۰]

جگر کے یہاں اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ ظہیر کاشمیری جگر کے تصور جمال کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جگر جمال کائنات کے تجسس میں معاشرہ پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اور جہاں کہیں آدمی جمال کائنات اور ازلی مسرت کا دشمن نظر آتا ہے۔ وہ نغمہ احتجاج بلند کر دیتے ہیں۔ آدمی اپنی حرص و ہوس کی تکمیل کے لیے مرد آزاد بن جاتا ہے۔ جگر کا تصورِ جمال ناگزیر طور پر انھیں انسان دوست بناتا ہے۔ وہ جمال کی بقاء کے لیے انسانی مسرت کے نقیب بن جاتے ہیں۔"[۴۱]

جگر مرادآبادی اپنے معاشرے کی اقدار میں بھی اسی حسن و جمال کو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ جگر کے یہاں حسن و جمال محض عورت کے حسن سے متعلق نہیں بلکہ اُن کے یہاں یہ تصور وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا جہاں زندگی کے ہر معاملے کو خوب صورتی اور بطریق احسن سرانجام دینا حسن و جمال کے زمرے میں آتا ہے اور یہی قدر جگر کی اخلاقی اقدار کا محور و مرکز ٹھہرتی ہے۔

عبوری دور کے شعرا نے سامراجی قوتوں اور نو آبادتی نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے برصغیر کے سیاسی اور سماجی منظر نامے پر گہرے نقوش ثبت کیے جس کے واضح اثرات عبوری دور کے غزل گو شعرا کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اپنے ذاتی، مذہبی اور قومی تشخص کی حفاظت کا اظہار قوت اور طاقت بن کر سامنے آتا ہے جو قوموں کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ عوام میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنا، اپنی مذہبی اور ملی روایات کے تحفظ کا گہرا شعور عطا کرنا اور حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے موقف پر ڈٹ جانے کا پرزور اظہار فلسفۂ اخلاق کی ذیل میں آنے والے اہم موضوعات میں جنھیں عبوری دور کے شعرا نے اپنی غزلوں میں برتتے ہوئے اردو غزل کو استحکام بخشا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ یوسف حسین خان، اُردو غزل، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۔۱۷

۲۔ حسرت موہانی، کلیاتِ حسرت موہانی، مرتب: ڈاکٹر علی محمد خاں، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۰ء، ص ۴۷

۳۔ ایضاً، ص ۵۹

۴۔ ایضاً، ص ۶۵

۵۔ ایضاً، ص ۷۱

۶۔ ایضاً، ص ۷۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۸۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۱۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو غزل، نعت اور مثنوی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۰

۱۲۔ بدایونی، فانی شوکت علی خاں، کلیاتِ فانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۹۲

۱۳۔ مغنی تبسم، فانی بدایونی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۹۔ قدوائی، صدیق الرحمن، پروفیسر، "نئی غزل کے پیش رو"، مشمولہ، اردو غزل، مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی، لاہور: پروگریس بکس، ص ۲۲۷

۲۰۔ مغنی تبسم، کلیاتِ فانی، ص ۳۷

۲۱۔ گونڈوی، اصغر حسین، کلیاتِ اصغر، ترتیب و تقدیم: ڈاکٹر محمد ہارون قادر، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۲۶۔ محمد اقبال احمد خاں، ڈاکٹر اصغر گونڈوی، آثار و افکار، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۱

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۰

۲۹ ایضاً، ص۲۴۳

۳۰ سعداللہ کلیم، ڈاکٹر، اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں(جلد سوم)، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ص۱۰۵۰

۳۱ محمد جمیل احمد، اُردو شاعری پر ایک نظر، کراچی: غضنفر اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۹۶ء، ص۴۳۹

۳۲ جگر مراد آبادی، کلیاتِ جگر، لاہور: خزینۂ علم وادب، ۲۰۰۳ء، ص۶۷

۳۳ ایضاً، ص۶۹

۳۴ ایضاً، ص۱۸۱

۳۵ ایضاً، ص۹۱

۳۶ ایضاً، ص۶۲۲

۳۷ ایضاً، ص۶۲۳

۳۸ ایضاً، ص۶۳۱

۳۹ ایضاً، ص۲۵۴

۴۰ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، غزل اُردو کی شعری روایت، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص۲۰۶

۴۱ ظہیر کاشمیری، "جگر کا فنِ غزل"، مشمولہ: جگر اور اُس کی شاعری، مرتبہ: انور عارف، کراچی: مکتبہ ماحول، ۱۹۶۶ء، طبع اول، ص۳۸۱